R.No. 2186/57 Regd. No. L.272.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت

[illegible]

فی پرچہ دس نئے پیسے
قیمت تین روپے سالانہ

جلد ۲۳۔ شمارہ ۴۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵۔ نومبر ۱۹۶۴ء

اداریہ

معمارِ اعظم کو خراجِ عقیدت

۱۴ر نومبر پنڈت نہرو کا جنم دن ہے۔ پنڈت جی آج زندہ ہوتے تو پچھتر سال کے ہوتے۔ کئی سال سے یہ دن بچوں کے دن یا بال دوس کے طور پر سارے ملک میں منایا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی بچوں سے محبت ضرب المثل تھی۔ یہ مستقبل سے کبھی نہ بجھنے والی امید کی لو کی طرح تھی۔ ہمارے اس ملک میں جس کی تاریخ اتنی پرانی اور اتنی شاندار ہے، بچوں کی طرف کسی نے اس طرح توجہ نہیں دلائی۔ ان کی صحت، تعلیم و تربیت، ان کے کھیل، ان کی غذا، ان کی معصوم خوشیوں اور بے ساختہ اداؤں کی طرف کوئی اس طرح مائل نہیں ہوا۔ یہ پنڈت جی کا طفیل ہے کہ ہم اب بچوں کی ضروریات کی طرف خاص توجہ کرنے لگے ہیں۔ اسی لیے نہرو کے جنم دن کے موقع پر بچوں کی اچھی اور سچی تعلیم اور ان کی دیکھ بھال پر دھیان دینا، نہرو اور ہندستان دونوں کے ساتھ وفاداری اور محبت کا ایک اور ثبوت ہوگا۔

نہرو کو رخصت ہوئے ساڑھے پانچ مہینے سے زیادہ ہوگئے۔ ان کا نام تو اب بھی ہر وقت لیا جاتا ہے، ان کی مناسب یادگاریں قائم کرنے کے لیے بھی کوششیں جاری ہیں، ان کے متعلق کتابوں اور رسالوں کے خاص نمبروں کا سیلاب بھی شروع ہوگیا ہے، مگر ہمیں یہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ کہیں یہ جذباتیت، نہرو کی قدروں کی طرف سے کچھ بے پروائی کی طرف نہ لے جائے۔ نہرو فرشتہ نہ تھے، انسان تھے۔ ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ کس میں نہیں ہوتیں۔ مگر انھوں نے ہندوستان سے جس طرح ٹوٹ کر عشق کیا، اس کی ساری تاریخ کو جس طرح سامنے رکھا، جدید دور کی ضروریات کی طرف جس طرح توجہ دلائی، معیارِ زندگی بڑھانے پر جو اصرار کیا، جمہوریت کا جو ڈھانچہ بنایا، سیکولرزم پر جو زور دیا، سوشلزم کے لیے جس طرح جدوجہد کی، مشترک تہذیب پر جس طرح فخر کیا، قومی زبان کے ساتھ انصاف کے لیے جس طرح آواز بلند کی، امن عالم کی تحریک کی جو خدمت کی، سائنس اور روحانیت کا جس طرح ملاپ کرنا چاہا، ہر قسم کے تعصب کے خلاف جس طرح جہاد کیا، اپنی تحریروں اور تقریروں میں جس طرح اچھی اور صالح قدروں کا پرچار کیا، جس طرح خدمت اور محنت کے آدرش کو پیش کیا، اس کا اعتراف تقریروں یا مضامین سے نہیں ہو سکتا، اس کے اعتراف کے لیے نہرو کی راہ پر چلنے کی ضرورت ہے۔ نہرو نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ماتم کیا جائے۔ ہاں وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے بنائے ہوئے خطوط پر، ان کی نکالی ہوئی راہ پر چلا جائے۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہوگا کہ ہم نہرو کا ماتم کم کردیں۔ ہاں قوم اور ملک کے لیے یہ بات بڑی نقصان دہ ہوگی اگر ہم نہرو کے بنائے ہوئے راستے پر آگے نہ بڑھ سکے۔ نہرو کے جنم دن پر ہمیں نہرو کے آدرش سے پھر وفاداری کا عہد کرنا ہے۔

اس شمارے میں

سنگ میں

آج کل کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں آپ کو کسی نہ کسی ادیب یا شاعر سے انٹرویو ضرور مل جائے گا۔ کچھ لوگوں نے تو اپنا یہ پیشہ بنا لیا ہے کہ جہاں کوئی مشہور ادیب یا شاعر وارد ہوا جھٹ اس سے انٹرویو لینے پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ یا تو مروّت کی وجہ سے وہ شاعر یا ادیب انکار نہ کر سکے گا، یا اُسے خیال ہوگا کہ اس کے افکار کی پبلسٹی ہو رہی ہے اس لیے تھوڑی سی باتیں کرنے میں کیا حرج ہے؟ اب اگر کوئی افسانہ نگار ہے تو اس سے یہ سوال ضرور ہوگا کہ نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں آپ کس کس سے متاثر ہوئے۔ اگر بدقسمتی سے اس نے چند نام گنا دیے تو ان کو چھوڑ کر باقی نئی نسل کے افسانہ نگار اس پرانے افسانہ نگار کے خلاف ضرور ہو جائیں گے اگر وہ شاعر ہے اور اس نے کچھ نئے شعرا کے نام لیے اور کچھ کے نہ لیے تو اس پر گروہ بندی یا جانب داری کا الزام ضرور لگ جائے گا اور اگر وہ نقاد ہے اور اس نے نئے نقادوں کے یہاں بڑھتی ہوئی یا حد سے بڑھی ہوئی انانیت کی طرف اشارہ کر دیا تو اب اسے اوروں کی تنقید کو رد یا برد کرنے پر بہت سے نئے پڑھنے والے فوراً آمادہ ہو جائیں گے۔ غرض یہ انٹرویو نہیں اچھی خاصی الکشوٹی ہے۔ اس لیے ہمارا کہنا ہے تو انٹرویو کبھی نہ دیجیے۔ ایسا ہی ہے تو مضمون لکھیے۔ اس میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تنقیدی مضمون کم لوگ پڑھتے ہیں شخصیات یا انٹرویو سے لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ دوسرے تنقیدی مضمون کے خلاف لکھنے کے لیے بھی کچھ تنقیدی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر انٹرویو میں جو مختصر رائے دی جاتی ہے اس کے متعلق ایڈیٹر کو خط لکھنے میں کیا جاتا ہے۔

مرزا غالب کا یومِ پیدائش

اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ادبی انجمنوں اور غالب کے قدر شناسوں سے درخواست ہے کہ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء کو ملک گیر طور پر ان کا یومِ پیدائش منانے کا اہتمام کریں اور مقامی حالات کے اعتبار سے جو پروگرام بنائیں اس سے اکاڈمی کو مطلع فرمائیں تاکہ شایع کیے جانے والے کتابچہ میں اس کا ذکر کیا جائے۔ (سکریٹری غالب اکاڈمی بنارس)

"باتیں جن میں سگندھ پھولوں کی"

احمد سلیم صاحب نے اپنی اس کتاب میں اردو کے مشہور ادیبوں کے خطوط کے اقتباسات اپنے COMMENTS کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ یہ کتاب ہندی میں ہے اور اس کو جناب گیان چند کاشی نے حسن و اہتمام سے شایع کیا ہے۔ (مختار حسن، محلہ نیم پورہ، سہسرام)

انجمن تحقیقاتِ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

صدر شعبۂ اردو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے مکان پر یکم نومبر کو ۹ بجے یوگوسلاویہ کے ادیب اور دانشور جناب پروفیسر زندرو ویج کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا جس میں اردو کے مشاہیر ادیب اور شعرا شریک ہوئے۔ عصرانے کے بعد بیگم انیس قدوائی کی صدارت میں ایک مختصر سی محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس کی ابتدا شہاب جعفری کی نظم "تلاش" سے ہوئی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صاحب، جناب مغیث الدین فریدی صاحب نے اپنی تازہ غزلیں اور ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی تازہ نظم "بادل" سنائی۔ ان کے بعد بیگم ذکیہ سلطانہ نیّر، جناب فرقت کاکوروی، جناب جگن ناتھ آزاد، پروفیسر احتشام حسین، جناب روشن صدیقی اور جناب ساغر نظامی نے اپنا کلام سنایا۔

دوسری نومبر کو ساڑھے چھ بجے فیکلٹی آف آرٹس کے کمرہ نمبر ۲۰ میں زیرِ صدارت پروفیسر سید احتشام حسین، شعبۂ اردو کی مجلس تحقیقات کا ایک جلسہ ہوا جس میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے "ذوق اور آزاد" کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ پڑھا۔ مقالے کے بعد بحث ہوئی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم اور ڈاکٹر محمد حسن نے حصہ لیا۔ آخر میں ڈاکٹر قمر رئیس نے جناب صدر کا شکریہ ادا کیا۔ شروع میں ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے پروفیسر احتشام حسین صاحب کا خیر مقدم کیا۔ سکریٹری

کوٹہ کی ادبی سرگرمیاں

بزمِ شعور کوٹہ کے زیرِ اہتمام جناب سرتاج رحمانی کے مکان میں ایک ادبی نشست پچھلے ہفتے منعقد ہوئی۔ چاند مظفر نگری، سرتاج رحمانی، بہار بدایونی، خمار اکبرآبادی، رویال متھرا، عقیل شاداب، مظفر پرواز اور شاد کوثری نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ یہ محفل شب کے ۲ بجے ختم ہوئی۔

(دریا ساگر، سکریٹری بزمِ شعور کوٹہ)

ہبلی میں ادبی نشست

۵ نومبر کی شب کو یوسف منزل محلہ ملا باڑ ہبلی میں ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت کے فرائض ہبلی کے ہر دلعزیز شاعر جناب اعظم ہبلوی نے انجام دیے۔ مقامی شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

یہ ادبی نشست رات کو ایک بجے ختم ہوئی۔

(غلام تبسم)

محمد انصار اللہ نظر

نواب حسین علی خاں اثر

حالات میں کوئی تبدیلی بغیر اسباب و وجوہ کے وجود میں نہیں آتی، ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ان اسباب کو دریافت کیا جائے تاکہ آیندہ بھی ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ ماضی کے واقعات حادثات اور کارناموں کے علم کا صحیح مصرف یہی ہے۔ اردو شاعری کا جو مخصوص انداز میر اور درد کے یہاں ملتا ہے مصحفی اور جرأت کے یہاں اس میں فرق پیدا ہونے لگتا ہے اور ناسخ کے زمانے سے اردو شاعری کا ایک بالکل مختلف دور شروع ہوجاتا ہے، یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ناسخ نے قدما کے طرز کو منسوخ کردیا ناسخ کے ذہن میں یہ نئے خیالات کیوں پیدا ہوئے؟ انھوں نے شاعری کا ایک نیا انداز کس طرح ایجاد کرلیا؟؟ ان سوالات کے جواب کے لیے ہمیں اس وقت کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ میر اور سودا کے زمانے میں ایسے شعرا بھی تھے جن کی محفل میں بادشاہ بھی آتا تو اسے وہاں کے آداب کی پابندی کرنی پڑتی تھی لکھنؤ آنے کے بعد میر صاحب نے وضع نباہی مگر قہر درویش برجان درویش کی مثل صادق آئی، آصف الدولہ مچھلیوں سے کھیلنے لگے تو میر صاحب نے انھیں متوجہ کرنا چاہا مگر مجبور ہو کر انھیں اپنی غزل جیب میں رکھ کر اٹھ جانا پڑا۔ انشا اور مصحفی کے زمانے میں حالات اور بگڑے اب شاعر امرا کی تفریح کا ذریعہ بن گئے ساتھ ہی درباروں میں بھی تبدیلی واقع ہوئی، لکھنؤ میں آصف الدولہ کے زمانہ ہی سے شاہزادہ سلیمان شکوہ کا دربار بھی قائم تھا، رفتہ رفتہ وہاں امرا اور نوابین کی کثرت ہوگئی، شاعر چونکہ دربار کی زینت ہوتا تھا اس لیے ہر نواب اور ہر امیر کی یہ تمنا ہوتی تھی کہ بڑے سے بڑا شاعر اس کے دربار سے وابستہ رہے، درباروں کی کثیر تعداد اور آپس کی رقابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعروں کی نگاہ میں ان کی کما حقہٗ عزت و توقیر بھی باقی نہ رہی، اب شاعر بڑی حد تک مطلق العنان ہوتا تھا، ایک دربار میں اگر کسی قسم کی پابندی عائد کی جاتی تو شاعر بڑی بے نیازی کے ساتھ قطع تعلق کرکے دوسرے دربار سے متعلق ہوجاتا تھا۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعروں اور شاعر نوازوں کی وہ توقیر اور حیثیت باقی نہ رہ سکی جو میر، سودا اور درد کے زمانہ میں تھی، دلی میں دربار تک پہنچنے کے لیے شاعر کوئی قصیدہ لکھتا تھا اب مختلف تقریبوں پر قطعات تاریخ کہہ لینا کافی تھا، مدحیہ قصائد کا زوال لازمی تھا۔ تاریخ گوئی کو اس دور میں جس قدر فروغ حاصل ہوا میر اور سودا کے زمانے میں ممکن نہ تھا شاعری کا مقصد بلکہ اس کی تعریف بھی اس دور میں بدل گئی اور اس تبدیلی کے اسباب کا بھی اس عہد کے امرا کے حالات کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس مقصد کے تحت ہم نواب حسین علیخاں اثر کے حالات سطور ذیل میں قلمبند کرتے ہیں کلب حسین خاں نادر ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں:

"اثر نواب حسین علی خاں بہادر ابن امیر الدولہ نواب مرزا حیدر بیگ خاں شاگرد حضرت ناسخ مغفور" (نادر صفحہ ۱۸)

نواب امیر الدولہ کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب رقمطراز ہیں:

"امیر الدولہ حیدر بیگ خاں، سرفراز الدولہ نائب آصف الدولہ کے نائب تھے مگر چونکہ سرفراز الدولہ اہل محض تھے عنان انتظام دراصل انھیں کے ہاتھ تھی" (طوفان صفحہ ۹۶)

نواب امیر الدولہ کا آخری زمانہ ناسخ کی ابتدائی مشق کا زمانہ تھا، ان ہی دنوں دار الحکومت فیض آباد سے لکھنؤ میں منتقل ہوا تھا ممکن ہے کہ اسی نسبت سے ناسخ نے نواب امیر الدولہ تک رسائی حاصل کرلی ہو۔ سنہ ۱۲۰۶ھ میں ان کا انتقال ہوا تو ناسخ نے قطعہ تاریخ کہا:

"تاریخ وفات امیر الدولہ بہادر نائب آصف الدولہ بہادر

زیب جہاں نواب حیدر بیگ خاں — عازم ملک عدم گردید ہائے
سال تاریخ وفاتش پیر عقل — گفت رحلت کرد امیر الدولہ وائے"

۱۲۰۶

"امیر الدولہ کے بعد ان کے پسماندگان کے حالات ہمارے موضوع سے متعلق نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ لکھنؤ میں با عزت بسر کرتے تھے، نصیر الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں ان کے ایک صاحبزادہ اکبر علی خاں بارہ دن تک کار ہائے نیابت انجام دیتے رہے" (بیگمات صفحہ ۱۳۳)

چھوٹے صاحبزادہ نواب حسین علی خاں اثر تھے جن کو نواب سعادت علی خاں کے عہد میں (سنہ ۱۲۲۴ھ میں) خلعت عطا ہوا، ناسخ نے پھر تاریخ کہی۔

"تاریخ خلعت شدن حسین علی خاں بہادر

چوں جناب امیر ابن امیر — یافت وقت سعید خلعت سعید
بہر تاریخ بانگ ہاتف غیب — زدش ناسخ شنید خلعت سعید"

۱۲۲۴

اثر کے ایک صاحبزادہ مرزا محمد تقی خاں کی شادی کا قطعہ تاریخ بھی ناسخ نے کہا، یہ غدر کے زمانہ میں محلہ منصور نگر لکھنؤ میں رہتے تھے (بیگمات صفحہ ۸۳)

اثر کی ولادت کا صحیح سال معلوم نہیں البتہ مصحفی ریاض الفصحا (سنہ ۱۲۲۱ تا سنہ ۱۲۳۶) میں کہتے ہیں کہ۔

"عمرش از چہل متجاوز خواہد بود" (ریاض ص۳۲)

ان کے استاد ناسخ کی عمر کے متعلق مصحفی کا بیان ہے کہ

"عمرش سی و ہفت سالہ است" (ریاض ص۳۴)

اگر یہ مان لیں کہ دونوں کے حالات مصحفی نے ایک ہی وقت میں لکھے تو یہ بات یقینی ہے کہ ناسخ عمر میں آثر سے چھوٹے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ناسخ نے نواب امیر الدولہ کی خدمت میں رسائی حاصل کر لی تھی تو اس حقیقت کے تسلیم نہ کرنے کی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ناسخ آثر کو بھی اپنا مربی جانتے ہوں گے (مرزا حاجی کے یہاں ناسخ کی رسائی بہت بعد میں ہوئی (دستور ص۹۳) اور ان کے بھی بعد نواب معتمد الدولہ تک پہنچے) آثر سے ناسخ کا استاد ہونا ممکنات میں ہے۔

ریاض الفصحا میں ناسخ اور آثر کے حالات قلم بند کیے جانے کا زمانہ اگر ۱۲۳۶ھ ہو تو آثر کی ولادت کا سال ۱۱۸۶ھ سے قبل قرار پائے گا۔ گارساں کا بیان ہے کہ ۱۸۶۵ء (مطابق ۱۲۸۲ھ) میں وفات پائی لیکن اس کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب کی قطعی رائے یہ ہے کہ

"یہ کسی طرح صحیح نہیں" (طوفان ص۲)

کریم الدین کا قول ہے کہ ۱۸۴۶ء (مطابق ۱۲۶۲ھ) میں انتقال کیا۔ [illegible] نے بھی اسی کو قبول کیا ہے اور آثر کی عمر ۹۰ سال لکھی ہے جس کا غلط ہونا یقینی ہے آثر نے ۷۰ سال سے کچھ زائد عمر پائی۔

آثر کے متعلق یہ کہنا کہ انھیں شعر گوئی کا ملکہ فطرت سے ودیعت ہوا تھا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا، البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ خود امیر تھے اور ان کے والد بھی امیر تھے، متعدد شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ اس عہد کے رؤسا کے رواج کے مطابق آثر بھی اپنے دولت خانہ پر کبھی کبھی مشاعرے کرتے تھے۔ ان مشاعروں کا ذکر مصحفی نے بھی کیا ہے کیا عجب ہے کہ انھوں نے کبھی شرکت بھی کی ہو۔

"میرزا حسین علی خاں متخلص بہ آثر خلف الصدق نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں بہادر مرحوم نائب وزیر الممالک ہندوستان یعنی نواب آصف الدولہ بہادر جنت آرام گاہ، جوانیست خوش تقریر و مہذب الاخلاق از ابتدائے عمر بہ صحبت کاملان اہل فن داشت و دو سہ بار در مکان ایشان مجلس مشاعرہ ہم زیور انعقاد یافتہ تا آنکہ جذب کامل شوقش بر سر آورد کہ خود ہم چیزی موزوں کردن شروع نمود و آخر از نظر شیخ امام بخش ناسخ کہ در معنی بندی تازہ علم استادی برافراشتہ اند و بہ فقیر ہم از قدیم دل دوستی دارند گذرانید" (ریاض ص۳۲)

شعرا کی صحبتوں نے بالآخر نواب حسین علی خاں کو شعر گوئی پر مائل کیا، آثر تخلص اختیار کیا اور ناسخ کے شاگرد ہوئے، وہ شعر جو جذبات سے مجبور ہو کر نہ کہا گیا بلکہ محض شوقیہ، دوسروں سے داد حاصل کرنے کے لیے کہا گیا ہو، علم و فضل، مشق و اکتساب کا مظہر ہو سکتا ہے حقیقی معنوں میں شعر نہیں ہو سکتا، جہاں مشق و اکتساب کو شاعری کی بنیاد بنا لیا جائے وہاں قافیہ پیمائی اور "بندش الفاظ" کے لطف کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہو گی۔ علم عروض، علم بدیع، علم معانی، علم بیان وغیرہ کا رواج ہو گا اور معمولی معمولی مطالب کو اس طرح نظم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اس سے شاعر کی بلند فکری اور قدرت خیال کا پتا چل سکے، معنی آفرینی اور نازک خیالی کا زور ہو گا۔ نواب آثر نے بھی علوم مذکورہ کو حاصل کیا چنانچہ کریم الدین کا قول ہے کہ

"بیچے رتبے کا عروضی سننے میں آیا ہے" (بحوالہ طوفان ص۹)

ایسے شعرا کے یہاں غزلوں کے مکمل ہونے کے لیے زیادہ وقت درکار نہیں ہو گا۔ آثر کا معاملہ بھی یہ تھا کہ بہت تیزی سے غزلیں لکھتے تھے اور ہر ہفتہ مشاعرہ کر کے ان پر داد حاصل کرتے۔ ناصر کا بیان اس موقع پر قابل لحاظ ہے۔

"کون سا ہفتہ تھا کہ شاعروں کی صحبت ان کے دولت خانے میں نہ ہوتی تھی، اسی میں دولت ان کی صرف ہوئی یہ یک چشم زدن گردش چرخ کہن نے اس منتظم روزگار کو عدم کر دیا اور شوق شاعری کو کم" (بحوالہ طوفان ص۹)

میر، درد اور مصحفی کے نزدیک شاعری "جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھی" وہ داد و ستائش کے لیے شعر نہ کہتے تھے بلکہ شعر دل کی بہاروں میں کھو جاتے تھے کیفیت یہ تھی کہ میر کو یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ کھڑکی کے دوسری طرف ایک پر فضا باغ ہے، یہ شاعر اپنے فن کی قدر کرتے تھے، ہر شخص کو شعر سنانا اپنے شعر کی توہین جانتے تھے لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا، اب شاعری کا مقصد خراج تحسین کے حصول کے سوا کچھ نہ تھا، شاعر ہر قسم کی ظاہری آرائش و زیبائش پر زور دیتے تھے تاکہ عوام کے ذہن (دل نشیں) ان کی طرف متوجہ ہوں نواب حسین علی خاں آثر کا حال یہ تھا کہ بقول صفیر:

"اپنے دیوان کو خوشخط لکھوا کر مطلا مہذب کیا تھا اور شعرا کی دعوت کر کے اپنا دیوان تکیہ پر رکھ کر سنایا کرتے تھے" (جلوۂ خضر بحوالہ طوفان ص۶۷)

اس قسم کا شاعر جیسے شعر کہہ سکتا تھا آثر بھی ویسے ہی کہتے ہیں نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ فرمائیے:

کشتۂ دیدار ہوں اک ماہ عالم تاب کا　　ہے کفن درکار مجھ کو چادر مہتاب کا

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

۱؎ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی [illegible] ناسخ کی عمر کے متعلق [illegible] ۷۰-۶۰ برس [illegible]
ناسخ کا انتقال ۱۲۵۴ھ میں ہوا [illegible] بیان صحیح ہے تو ناسخ کی ولادت ۱۱۹۰ھ کے قریب ہوئی
چاہیے۔ مصحفی نے ان کی عمر ۳۷ سال لکھی ہے یعنی وہ ۱۲۲۶ھ کے قریب کے حالات لکھ رہے
تھے۔ نواب امیر الدولہ کی وفات کے وقت ناسخ کی عمر ۹-۱۰ سال کے قریب ہونی چاہیے
قطعہ تاریخ کہنے کے لیے یہ عمر کچھ کم نہیں [illegible] البتہ شہرت حاصل ہونے کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔

غزلیں

دتی دیوی ٹونکی

پکارا پھر کسی شوریدہ سر نے / بہت مشکل ہیں اب گیسو سنورنے
یہی ہے میری روداد اسیری / مجھے یہ دن دکھایا بال و پر نے
نہ پایا گرد کو اہل جنوں کی / شعور عقل و ادراک نظر نے
کلید قفل دل ہے چشم بینا / ہزاروں راز کھولے اک نظر نے
حدود شش جہت کو توڑ ڈالا / جواں کوشی پرواز بشر نے
عجب حیرت بھری ہے آئینے میں / مآل اندیشیٔ آئینہ گر نے
نہ ٹھہرا کاروان شوق اے دل
بہت روکا طلسم رہگذر نے

ناظر الحسینی

سنگ و آہن کے تصور میں ڈھلتے ہیں ہم تو / منزل دار سے بھی دور چلے ہیں ہم لوگ
تیرگی شب ہجراں کو مٹانے کے لیے / شمع کے ساتھ بجھے اور جلے ہیں ہم لوگ
لب رخسار سے آگے بھی ہے منزل کوئی / کب کسی زلف کے سائے میں پلے ہیں ہم لوگ
بے نیازی کا بھرم کھل کے رہا آخر کو / داد غم لی ہے تو مشکل سے ٹلے ہیں ہم لوگ
ہم کو پامالی احساس کا الزام نہ دو / ساتھ ہر قافلۂ دل کے چلے ہیں ہم لوگ
تم جو حسرت پرور رہے لیکن ہی نہیں / کتنی امیدوں کے دامن میں پلے ہیں ہم لوگ
کسی فرعون سے مرعوب سے دب کر ناظر
مسلک زیست سے اک پل نہ ٹلے ہیں ہم لوگ

اقبال ردولوی

ذکر میرا جو چھڑ گیا ہو گا / دل ہی دل میں وہ رو دیا ہو گا
اب تو مدت ہوئی فسردہ ہے / غنچۂ دل کبھی کھلا ہو گا
میرے غم کا اثر نہیں ہوتا! / آپ کا دل ہی حساس ہو گا
میری وحشت کا ذکر مت کرنا / وہ پریشان اے صبا ہو گا
آپ گلشن میں جب گئے ہوں گے / رنگ پھولوں کا اڑ گیا ہو گا
ہم بھی اس کی نوا کے مارے ہیں / میر کا نام تو سنا ہو گا
اس طرح یاد بار بار نہ کر! / دل کسی کا دھڑک رہا ہو گا
جس سے نظریں تری ملی ہوں گی / خود کو وہ شخص ڈھونڈتا ہو گا
اس طرح جو خموش ہیں اقبال
پھر کوئی یاد آ گیا ہو گا

دیوبند حسین ریحانی

مژدۂ صبح انقلاب کہاں / دور ظلمت ہے آفتاب کہاں
رند کب تک امیدوار رہیں / وا ہوا میکدے کا باب کہاں
ٹوٹے دل کی ہیں سسکیاں یکسر / نغمۂ بربط و رباب کہاں
رہبری کر رہے ہیں جو رہبر / ان کے اعمال کا حساب کہاں
تاجداروں کا حال ہم سے پوچھ / تو نے دیکھا ہے انقلاب کہاں
لوگ سمجھے جسے کامیاب [illegible] / در حقیقت وہ کامیاب کہاں
آئی فصل بہار دیکھا کی / روئے گل پر وہ آب و تاب کہاں

سہیلہ موضع ٹونک میں مشاعرہ

۲۲ر اکتوبر ۱۹۶۶ء کو شہر ٹونک سے بارہ میل دور جے پور روڈ پر آباد ایک گاؤں "موضع سہیلہ" کے پرسکون و دلفریب مقام پر جہاں ہر طرف قدرتی حسن بکھرا پڑا تھا۔ "شعر و سخن" کی ایک ادبی و تاریخی مجلس منعقد ہوئی۔ مشاعرہ میں ٹونک کے متعدد شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ مشاعرہ میں سامعین کی بھی ایک معقول تعداد مدعو تھی۔ بانیان مشاعرہ کی طرف سے لاریوں اور بسوں کا انتظام تھا۔ یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا پہلا "دیہی مشاعرہ" تھا۔ مشاعرہ کی صدارت حبیب الرحمن خاں صاحب چیرمین میونسپل بورڈ ٹونک وصدر انجمن ترقی اردو نے فرمائی۔

(سید منظور الحسن برکاتی سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک)

"شیکسپیر کے ساتھ ایک شام"

انجمن اردوئے معلی کا افتتاحی جلسہ ۹ر نومبر کو سوا چھ بجے شام فیکلٹی آف آرٹس کے کمیٹی روم نمبر ۶ میں شیکسپیر کی یاد میں ہوا۔ شیکسپیر کے ساتھ شام گزارنے والوں میں پروفیسر بھی تھے اور لکچرر بھی طالبات بھی تھیں اور طلباء بھی۔ اس شام کو حسین تر بنانے کا کام جناب مسعود علی ذوقی، جناب سجاد ظہیر، جناب ڈاکٹر منیب الرحمن اور جناب حبیب تنویر نے انجام دیا۔

ان حضرات نے بالترتیب کنگ لیر، اوتھیلو، اور انٹونی اور کلوپیٹرا کے چند حصوں کے ترجمے سنائے۔ ترجمے جناب مجنوں گورکھپوری (کنگ لیر) جناب سجاد ظہیر (اوتھیلو) اور جناب ڈاکٹر منیب الرحمن (انٹونی اور کلوپیٹرا) کے تھے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے اس جلسے کی صدارت کی۔ اور اپنی مختصر تقریر میں شیکسپیر کے ڈراموں کے اردو ترجموں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں انھوں نے مہمانان خصوصی جناب سجاد ظہیر جناب حبیب تنویر اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

(سکریٹری انجمن اردوئے معلی شعبۂ اردو، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔)

ہندی کے مشہور ادیب کا انتقال

بھوپال ۹ر نومبر یہاں کل رات ہندی زبان کے مشہور مصنف ظہور بخش کا ۷۵ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان پر فالج کا ہلکا حملہ ہوا تھا۔ ظہور بخش صاحب نے بچوں کیلئے بہترین کتابیں تالیف کی ہیں شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں کا فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔ بھوپال ریاست کے سابقہ فسادات میں انکا کتب خانہ تباہ ہو گیا تھا اس کے بعد ہندی کے ادیبوں نے ان کی مدد کی مہم چلائی تھی مرحوم بھوپال ہی میں مقیم تھے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

دل مرا اس کے ذقن میں آ کے ڈوبا ہیں　　کھینچنا اپنی طرف معمول ہے گرداب کا
ڈو عشوؤں سے ہیں مگر کبھی ہم عاشق مزاج　　جب غبار اپنا اڑا ہالہ بنا مہتاب کا
رہ گئے ہیں جواب خط کی ہم آنکھوں پھیر　　خط ہمارا تھا پر پرواز گویا خواب کا

کہا جاسکتا ہے کہ یہ طرز شاعری ناسخ کا ایجاد ہے اور آثر چونکہ ناسخ کے شاگرد تھے اس لیے انھوں نے بھی یہی طرز اختیار کرلی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی طرز محض اختیار کر لینے سے "اختیار" میں نہیں آجاتا۔ میر، سوز اور درد کے تلامذہ بھی تھے، ان کو بھی اپنے استاد سے عقیدت تھی، وہ بھی اپنے استاد کے طرز کو اپنا لینا چاہتے تھے لیکن اس وقت حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی روش کو استقلال یا استحکام نہ تھا، ہر صبح نئی صبح اور ہر شام نئی شام تھی، لکھنؤ میں نئی حکومت کے قیام سے جو حالات پیدا ہوئے اور جو ماحول وجود میں آیا کم و بیش وہی آخر تک برقرار رہا بلکہ وہاں کے دستداروں نے بعد غدر بھی وضع کو مدتوں نباہا، غالباً یہی سبب ہے کہ میر، سوز، درد وغیرہ کے تلامذہ میں ان کے طرز کو نباہنے میں شاید کوئی کامیاب ہوا ہو، اس کے برخلاف طرز ناسخ چونکہ اس مخصوص ماحول کی تخلیق تھا اس لیے نہ صرف تلامذۂ ناسخ بلکہ اس عہد کے اکثر و بیشتر شعرا میں بہت جلد مقبول ہوکر عام ہوگیا، مصحفی جیسے سن رسیدہ کہنہ مشق استاد نے بھی اسی طرز کو قبول کر لیا، میر، سوز اور درد کے مخصوص طرز کی تخلیق میں ان کے اپنے مزاج اور طبیعت کو بہت دخل تھا، ناسخ کے عہد میں جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس نے طبیعتوں میں بڑی ہم آہنگی پیدا کر دی تھی، یہ ہم آہنگی بھی اس نو ایجاد طرز کو عام طور پر مقبول بنا دینے میں بہت حد تک ممد و معاون ثابت ہوئی۔

آثر کے سلسلۂ حالات میں مصحفی نے ایک بہت اہم بات اور بھی لکھی ہے:۔

"چوں دراں ایام اعتقادش بجناب ائمۂ معصومین بیشتر بود و در شیعہ گری غلوی تمام داشت، کلام شعر از قسم منقبت پسندیدۂ خاطر بود لہٰذا بعد مشق شعر نعتیہ در گفتن مرثیہ و سلام سعادت ابدی پنداشتہ خود را معروف ایں کار ساخت" (ریاض ص۔۔)

اودھ کی نئی سلطنت کا مذہب مشہور و معلوم ہے، اس کا اثر وہاں کی رعایا پر بھی پڑنا ناگزیر تھا، پھر اثر تو خود امرا میں سے تھے، ان کے یہاں مرثیہ و سلام و منقبت کا ہونا کچھ تعجب نہیں۔ ان کے استاد ناسخ کی غزلوں میں بھی مذہبی خیالات کا دخل اتنا زیادہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کو بھی کھٹکا، مولانا اس سلسلہ میں رائے زنی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"وہ اکثر غزلوں میں مذہبی تعریفیں کرتے تھے اور یہ شاعر یا عام مصنف کے لیے نازیبا ہیں، ہاں کوئی اپنے تائید مذہب میں کتاب لکھے تو اس میں دلائل و براہین کے تفصیل سے جو چاہے کہے مضائقہ نہیں" (آب حیات ص۔۔)

لیکن یہ آزاد کی ذاتی رائے ہے، اس عہد کے شعرا کے یہاں یہ رجحان عام ہے۔ بہرحال نساخ کی رائے آثر کے متعلق یہ ہے کہ:۔

"شعر خوب کہتے ہیں" (نساخ ص۔۔)

ان کی تصانیف کے متعلق محسن کا قول ہے:۔

"نواب حسین علی خاں بہادر مغفور اثر چھوٹے بیٹے امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے نائب نواب آصف الدولہ بہادر باشندہ لکھنؤ صاحب دیوان مع قصائد و مثنوی شاگرد ناسخ" (سراپا ص۱۹)

سریرام کا قول ہے کہ ان کا دیوان رامپور میں ہے، معلوم نہیں اب بھی یہ موجود ہے یا ضایع ہوگیا۔ ان کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایتی الفاظ کے استعمال سے زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور استاد کے نقش قدم پر چلتے ہیں مثلاً:۔

نزع کے دن بھی کہیں ہجر کی شب جاری ہے　　نور مہتاب میں بھی گور کی اندھیاری ہے
نہ ہوئے مر کے بھی آزاد یہ قیدی زلف　　خاک کو کنج ہوا دام گرفتاری ہے
کاش ہوتے نہ بعد آدم و حوا باہم　　یہ وہی رسم ہے جو آج تلک جاری ہے
اے اثر گور میں ہوتا ہے گلی کا دیدار　　زیست بے موت مجھے اس لیے بھاری ہے
عاشقوں پر قفس بلبل نالاں سر پر　　آج صیاد لیے پھرتا ہے زنداں سر پر
تابش مہر قیامت سے اثر ہو محفوظ　　ہاتھ رکھ دیں جو کرم سے شہ مرداں سر پر

ابن امین اللہ طوفان نے ضمناً آثر کے متعلق ایک اطلاع اور دی ہے۔

"بحر تخلص از متوطنان فیض آباد است در ہیں جزو زماں در لکھنؤ بہ رفاقت علی حسین خاں آثر فرزند کہیں نواب حیدر بیگ خاں مرحوم است" (طوفان ص۔۔)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آثر ۱۲۰۵ھ کے قریب لکھنؤ میں مقیم تھے اور ان کے دامن دولت سے وابستہ شعرا میں شیخ امداد علی بحر بھی تھے اثر کی شاعرنوازی کا قابل قدر ہے انکے حالات کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو لکھنوی طرز شاعری کی ارتقائی مدارج کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

توضیح علامات

نادر: تذکرہ نادر مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب مطبوعہ ۱۹۵۷ء
طوفان: تذکرۃ الشعرا مولفہ ابن امین اللہ طوفان مرتبہ قاضی عبدالودود مطبوعہ ۱۹۵۴ء
نساخ: سخن شعرا مولفہ عبد الغفور خاں نساخ
سراپا: تذکرہ سراپا سخن مولفہ محسن علی محسن
دستور: دستور الفصاحت مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ ۱۹۴۳ء
آب: آب حیات مصنف مولانا محمد حسین آزاد
ریاض: ریاض الفصحا مصنف شیخ غلام ہمدانی مصحفی
بیگمات: بیگمات اودھ مصنف شیخ تصدق حسین

سلہ اثر کا صحیح نام حسین علیخاں تھا (دیکھو شیفتہ، باطن ص۔۔، سرور، رضا وغیرہ)، علی حسین خاں صحیح نہیں

مراسلات

لطف اللہ مہندس بن احمد معمار

جناب بیکش اکبر آبادی صاحب کے مراسلہ (ہماری زبان ۸ ر ستمبر ۱۹۶۲ء) کا جواب لکھتے وقت راقم کے پیش نظر معارف ۱۹۳۶ء کا نامکمل فائل تھا جس میں مارچ ۱۹۳۶ء کا شمارہ نہ تھا اور نہ اس وقت "مضامین سلیمان ندوی" اور "تاج محل" (محمود بنگلوری) ...... کتابیں ...... تھیں ...... جناب مولوی صباح الدین صاحب ندوی نے محمود بنگلوری کی کتاب ...... "تاج محل" ...... سے از رو بندہ نوازی تقریباً پچاس صفحے نقل کرا کے مرحمت فرمائے ہیں۔

ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن سے لطف اللہ مہندس کے نام، تخلص، حالات اور فن پر روشنی پڑتی ہے۔

منکہ ہستم فقیر لطف اللہ — بمہندس شہیر در افواہ
خاکپائے ہنروران کبار — پور استاد احمد معمار

(منتخب الحساب۔ قلمی نسخہ علی گڑھ۔ آصفیہ حیدرآباد۔ بحوالہ مضامین سلیمان ص ۳۰)

نعتیہ قصیدہ کے آخر میں مہندس نے اپنا اور اپنے باپ کا نام اور اپنے درس و تدریس کے شغل کا ذکر کیا ہے۔

باش لطف اللہ احمد چہ کنی فخر بعلم
جہل ازیں علم تو بہتر کہ نیاید بعمل
عمر در درس بسر بردی و در آخر کار
ہیچ حاصل نشد از مدرسہ جز بحث و جدل

(مضامین سلیمان ص ۳۵)

لاہور لطف اللہ کا وطن تھا۔

کے بود آمدن قاصد فرخندہ پیام
مدتے شد کہ ز لاہور نیامد خبرے

مہندس اس کا لقب تھا۔

گرچہ مہندس لقبم از شہ است
نام من دل شدہ لطف اللہ است

(مثنوی مہندس۔ دیوان)

ذیل کے اشعار سے اس کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

خواہم کہ کشم بادہ چو لطف اللہ احمد
تا چند کشم منت دو دیر قمری را

بچو لطف اللہ احمد کو چین دانش می زدم
چون شدم عاشق بجہل خویش کردم اعتراف

در حلقۂ ابلہان مہندس
بازیست نشستہ در زغن ہا

علم ہندسہ، منطق اور حکمت میں اپنی خداداد قابلیت کا یوں اظہار کرتا ہے۔

بر من ہیچ جاں گشت شد از فیض ازل
راز سربستہ کہ بر ہندسہ داں مشکل بود

صرف در منطق و حکمت شدہ ایں عمر عزیز
لیک آں نکتہ نخواندم کہ در و حاصل بود

کبھی عمر عزیز کے خراب ہونے کا ذکر کرتا ہے۔

صرف بیہودہ شد مہندس عمر
میکنم صبح و شام آوخ و آخ

دوسری جگہ علم ہندسہ کی بدولت "بحر محیط" سے آشنائی کا بیان ہے۔

از دولت ہندسہ مہندس
با بحر محیط آشنا شد

جا بجا اشعار میں فن تعمیر میں اپنی مہارت پر فخر کرتا ہے

لطف اللہ معمار مہندس شد و استاد
گر کار درایت نکند پس چہ کند کس

بدستیاری لطف شہ بلند اقبال
بلند پایہ ز من گشت قدر معماری

دمے کہ من بعمارت گری شوم مشغول
ملک مصالح کار آورد بسر باری

ما ہمہ معمار و عمارت گریم
ما ہمہ استاد و سخن پروریم

دارا شکوہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے، اس میں شاعر نے اپنے علم و فن کے کمال کا ذکر یوں کیا ہے۔

مہندسم کہ کنم صورتِ فلک تصویر
کشم بروئے زمیں گر خطوطِ پرکاری
چنان بلند نہادم اساسِ قصرِ خرد
کہ نورِ مہر بود نزدِ نورِ او ناری
ولی کہ من بعمارت گری شوم مشغول
ملک مصالحِ کار آورد بسر باری
بدستیاریِ لطفِ شہِ بلند اقبال
بلند پایہ ز من گشت قدرِ معماری
سپہر مرتبہ داراشکوہ دریا دل
کہ ہمچو ابر کفش می کند گہر باری
بعہدِ دولتِ تو راجہ ہائے کوہستاں
ز فرقِ خویش نہادہ کلاہِ جباری
بیک نگاہ کہ کردی بسوئے کوہستاں
گرفتہ پستی و بلندیِ کوہ ہمواری

غالباً شہزادہ داراشکوہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مثنوی میں کہتا ہے۔

لطفِ شہ گر کند مددگاری
ورنہ آگہ نیم ز معماری

ایک قصیدہ میں کہتا ہے دلِ خانہ خراب کی ویرانی و بربادی اس بات کا اشارہ ہے۔ کہ اس کو معماری سے کیا نسبت؟

شہا اگرچہ عمارت گریست پیشۂ من
دگرچہ نیست ضمیرم ازیں ہنر عاری
کنوں کہ ملکِ دلم شد خرابِ عشقِ بتاں
تو خود بگو کہ چہ نسبت مرا بمعماری

ایک قطعہ میں وہ شاعری کو معماری سے برتر قرار دیتا ہے۔

ثناخوانِ ترا شاہا چہ حاجت مدحِ جم گفتن
بکامِ بادہ حاجت نیست مستِ جامِ سرمد را
چو می خواہی کہ باشد بانیِ قصرِ ثنائے تو
بکارِ خشت و گل بگذر ز لطف اللہ احمد را

شاہ داراشکوہ کی معرفت شاہ جہاں تک رسائی کا خواہشمند نظر آتا ہے۔

لطفِ شہزادۂ بلند اقبال
گر شود بندہ را معاونِ حال
خدمتِ بندہ را بعرض رساند
کہ ز دستم رفتہ باز آید
گر یکے از مقربانِ بساط
در دمِ عیش و در زمانِ نشاط
این سخن از سقیمِ این درگاہ
برساند بسمعِ حضرتِ شاہ
اجر یابد ز کردگارِ کریم
نہ کہ اجرِ قلیل اجرِ عظیم

داراشکوہ نے مہندس سے اپنا ایک محل بنوایا تھا۔ اس کا قطعۂ تاریخ ملاحظہ کیجیے۔

چو بنا کرد قصرِ جاہ و جلال
ظلِ حق بادشاہِ عالی ملک
شبہِ ایں عمارتِ والا
یافت چوں مہر بر حوالیِ ملک
گفت معمار قصرِ تاریخش
قصرِ داراشکوہ والیِ ملک

داراشکوہ کے بعد اورنگ زیب کے عہد میں مہندس کی کس مپرسی کا عالم نہ پوچھیے۔

مہندس ازاں روزہ داری و طاعے
کہ چوں زاہدان خانقاہے نداری

لطف اللہ کا تخلص مہندس تھا۔ ذیل کے شعروں میں مہندسی کی رعایت کا لطف ملاحظہ کیجیے۔

مہندس گرچہ آگہ بود زیں پیش　　فراموش کرد قانونِ شفا را

باشد ز فلک مہندس آگاہ　　با آنکہ نشستہ بر زمین است

گرچہ قانونِ شفا کس چو مہندس نشناخت　　لیک تصدیعِ دلِ عشاق بجائے دگر است

ز مہندس بعلم یک ورقہ شکل　　ایں ہمہ افتخار بے معنی است

از مہندس نہ بود گنجِ ہنر　　گرچہ گنجِ درم آخر شد و رفت
اے مہندس رو کہ در علمِ نظر　　احتیاجِ مسطر و پرکار نیست
ہاں حرفِ زمیں بگو مہندس　　تا کے ز فلک کنی حکایت

در دمِ آخر مہندس چوں حساب　　دیدہ پندار می خواہیم ما

مہندس ترا با کتاب است الفت　　من مست را با ایاغ است نسبت

ستہ بان مہندس بگذر از برہان خویش — نزد ما برہان تو منظور نیست

با اگر جملہ لات گردان رست مہندس — دیدیم ز سر تا قدم او بیش نیست

بان مہندس کہ بود تاج تصوف بر سرش — آنکہ گفتش صوفی کامل حیات بند داشت

آنجا کہ عشق شعلہ زند عقل خس شود — دارد مہندس از کف دیوانہ الغیاث

در شب وصل تو مہندس را — ہم شب قدر دہم شب معراج

بان مہندس دے بدست آور — کہ ستانند رونمائے قدح

مہندس کو اگر بیاید بکار — صد چہر را کن فدائے قدح

دارد خبر از جہان مہندس — الا خبر از دیار آن شوخ

گرد من و نگار مہندس شود حجاب — دستش گرفتہ زود ز محفل بدر کنید

سر جہاں را چو خود گرد آشکار — پس مہندس را چرا بدنام کرد[1]

برق فیض ازلی بر دل میداران زد — حیف صد حیف مہندس ہمہ شب خفتہ نبود

زان مہندس محبت عیبت ارباب زہد — کیں جماعت طعنہ بر اصحاب خوش کنند

---

[1] عراقی — چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردند

(لطف الدین احمد سمار شیخ فرید)

نصیر الدین ہاشمی مرحوم

آج اردو کو ایک ظلم خیز دور کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اردو ادب کے کئی درخشندہ ستارے گل ہو گئے ہے

"ہم بھور کے دئے ہیں بجھتے ہی جا رہے ہیں"

حیدرآباد کے نامور ادیب و محقق لسانیات جناب مولوی سید نصیر الدین ہاشمی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر سخت افسوس ہوا۔ اردو کے شیدائیوں کو ناقابل تلافی نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔ مرحوم کی تصانیف کی میزان ۳۰ تھی جن میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت "دکن میں اردو" کو بجا طور پر حاصل ہوئی۔ اس کے کئی اڈیشن شایع ہوئے۔ قدیم دکنی اردو پر آپ کو خصوصی عبور حاصل تھا اور اس کے بارے میں آپ اتھارٹی مانے جاتے تھے۔

کتب خانوں کے قیمتی نوادر کی فہرستیں مرتب کرنے میں آپ کو ملکۂ خصوصی حاصل تھا اور اس اعتبار سے بھی آپ لاثانی سمجھے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے مشہور کتب خانوں، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ سالار جنگ وغیرہ کے مخطوطات کی مفصل و مستند فہرستوں کے علاوہ آپ نے یورپ کا دورہ کر کے "یورپ میں دکنی مخطوطات" کے نام سے ایک جامع فہرست شایع کی تھی۔ افسوس آپ کے انتقال سے حیدرآبادی تہذیب کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔

آپ کی تصانیف آپ کے نام کو زندہ جاوید رکھیں گی۔

(اشفاق حسین کانپور)

شکایات

اٹاوہ کے میونسپل اسکولوں میں اردو

جناب من! ۱۹۴۷ء سے قبل شہر کے قریباً تمام اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام تھا لیکن اس کے بعد ایک دم سے اردو کی تعلیم بالکل بند کر دی گئی۔ ایک حکم کے ذریعے رجسٹروں کی خانہ پری وغیرہ ہندی میں کرنے کا حکم دیا گیا ہے اساتذہ کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ حاضری کے رجسٹر میں بھی ہندی میں دستخط کیا کریں چند سال کے بعد بہت کوشش کرنے پر میونسپل اسکولوں میں دوبارہ اردو کی تعلیم کی تجویز منظور کی گئی اس وقت شہر میں میونسپل بورڈ کے ۱۲۰ اسکولوں میں سے صرف چار اسکولوں میں برائے نام اردو کی تعلیم کا انتظام ہے جب کہ اردو بولنے والوں کا تناسب شہر میں کسی طرح بھی متقاضی ہے نہیں کم ہے اس طرح شہر میں کم از کم اردو کے دس اسکول ہونے چاہئیں۔

ان چار اسکولوں میں جہاں اردو کی تعلیم ہے دو اسکول لڑکوں کے ہیں اور دو لڑکیوں کے ہیں کہنے کو میونسپل بورڈ کی طرف سے ان میں اردو پڑھانے والوں کا انتظام بھی ہے لیکن گزشتہ دس سال سے ان اسکولوں کے ایک لڑکے یا لڑکی نے بھی پرائمری امتحان اردو میں پاس نہیں کیا جب کہ پانچ چھ سو لڑکے اور لڑکیاں ہر سال پرائمری امتحانوں میں شریک ہوتے ہیں ان میں اردو کے طلبا اور طالبات صرف دو پرائیویٹ اداروں سے شریک ہوتے ہیں لیکن ان کو بھی امتحان کے پرچے ہندی میں دئیے جاتے ہیں صرف جواب اردو میں لکھنے کی اجازت ہے اس بات کی ضرورت ہے کہ میونسپل بورڈ کے مزید اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے ان تسلیم شدہ اور پرائیویٹ اداروں کو معقول گرانٹ دی جائے جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے اس کے علاوہ شہر کے دونوں نارمل اسکولوں میں میونسپل بورڈ کے جو نامزد طلبا اور طالبات جاتے ہیں ان میں اردو جاننے والے طلبا، اور طالبات کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

(امتیاز الدین اٹاوہ)

(منقول از الجمعیۃ دہلی)

یوم زور

دبستان دکن کے آخری معلم دکنیات اور لسانیات کے ممتاز ماہر مشہور محقق اور ممتاز تنقید نگار پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم (ولادت ۲۵ دسمبر ۱۹۰۵ء حیدرآباد - وفات ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء سری نگر) کی دوسری برسی کے موقع پر ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اردو بلدۂ حیدرآباد میں یوم زور کی سہ روزہ تقاریب کا آغاز ۲۲ ستمبر سے ہوا۔ "ایوان اردو" میں ۲۲ ستمبر کو ساڑھے پانچ بجے صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ادارہ کے اردو میوزیم میں ترتیب دی گئی کتابوں کی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ نمائش تین ابواب پر مشتمل تھی۔ پہلے باب میں ڈاکٹر زور کی تمام تصانیف و تالیفات کو پیش کیا گیا تھا۔ ایک طرف ان تمام رسالوں اور جریدوں کو ترتیب دیا گیا تھا جن میں زور مرحوم کے مضامین نظم و نثر شائع ہوئے تھے اور دوسرے باب میں ایسے رسالے اور کتابیں تھیں جن میں ڈاکٹر زور کے بارے میں مضامین، مقالات اور نظمیں شامل تھیں۔ نمائش کے تیسرے گوشے میں ایسی کئی تصویریں تھیں جن سے ڈاکٹر زور کی ادبی اور تہذیبی مصروفیات نمایاں ہوتی تھیں۔ اسی دن بعد نماز مغرب پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں ادبی اجلاس کا آغاز ہوا۔ اجلاس سے قبل صدر موصوف نے ڈاکٹر زور کی اس تصویر کی نقاب کشائی فرمائی جسے ادارے کے ایک بڑے محسن اور مرحوم کے عزیز دوست نواب عنایت جنگ بہادر نے عطا فرمائی تھی۔

ادبی اجلاس کا آغاز نائب صدر ادارہ پروفیسر عبدالمجید صدیقی کے حرف آغاز سے ہوا۔ پروفیسر صدیقی نے کہا کہ "یہ جلسہ محض اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ ہم لوگ اپنی زبان اور تہذیب کے محسن ڈاکٹر زور کی یاد کو تازہ رکھیں۔"

ریاست حیدرآباد کے سابق ناظم تعلیمات مولوی فضل الرحمن نے موتی لال نہرو نیشنل یوتھ سنٹر کی جانب سے زور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

جناب ایم باگا ریڈی (ایم۔ ایل۔ اے) صدر انجمن تحفظ اردو نے کہا کہ "ڈاکٹر زور کی ادبی خدمات اہل ملک کے لیے قابل فخر ہیں۔"

۲۴ ستمبر کو ساڑھے نو بجے شب طرحی مشاعرہ ہوا۔ ایوان اردو کے سجے سجائے مشرقی تہذیب کی سماعت گاہ میں اہل ذوق نے ایک بجے شب تک شعرا کا کلام سنا۔ علامہ حیرت بدایونی صدر اور وقار خلیل معتمد مشاعرہ تھے۔ غزل کا مصرع "عہد پیری میں بھی اے زور جواں ہیں کچھ لوگ" تجویز کیا گیا تھا۔ غیر طرحی دور میں مہمان شعرا خواجہ حمیدالدین شاہد (کراچی) اور کیلاش ماہر (دہلی) نے اپنا کلام سنایا۔ محترمہ تہنیت زور کی غزل اختر واجدی نے سنائی اور وقار خلیل کے شکریے پر یہ محفل برخاست ہوئی۔ یوم زور کے موقع پر حیدرآباد کے اخبارات و رسائل نے خصوصی مضامین نظم و نثر شائع کر کے ڈاکٹر زور مرحوم کے علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ (وقار خلیل)

نصیرالدین ہاشمی کی وفات پر جلسہ

حیدرآباد۔ ادارۂ ادبیات اردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے یکم اکتوبر ۶۴ء کو چھ بجے شام "ایوان اردو" واقع پنجہ گٹہ روڈ پر ممتاز ادیب اور محقق مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی کے سانحۂ ارتحال پر جلسۂ تعزیت صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔

نائب صدر ادارہ پروفیسر محمد عبدالمجید صدیقی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ "ہاشمی صاحب مرحوم درسگاہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل تھے۔ انھوں نے بیس پچیس سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا اور آخر عمر تک یہ مشغلہ جاری رہا۔ ادب، تاریخ اور کلچر کے موضوع پر درجنوں کتابیں لکھیں۔ ادارۂ ادبیات اردو سے ہاشمی صاحب کی دیرینہ وابستگی رہی ہے۔ وہ ادارہ کے بانیوں اور اس کے بہی خواہوں میں سے تھے۔ خواتین دکن میں علم و تحقیق کا شوق پیدا کرنے میں ہاشمی صاحب نے گرانقدر حصہ لیا۔ افسوس کہ حیدرآباد نے اس عالم کی قدر و منزلت نہیں کی۔" پروفیسر صدیقی کی تقریر کے بعد وقار خلیل نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شریف النساء انصاری لکچرار ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ اور محترمہ جہاں بانو نقوی صاحبہ نے ہاشمی صاحب کی ادبی اور سماجی خدمات پر مقالے پڑھے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی نظم "پیغام اردو" جناب محمد منظور احمد صاحب نے سنائی۔

تقاریر کے بعد قرارداد تعزیت منظور کی گئی اور سب کی خاموشی اور پھر فاتحہ کے بعد جلسہ غم و الم کے ماحول میں اختتام کو پہنچا۔ (وقار خلیل)

سلام مچھلی شہری کو صدمہ

۳۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو سلام مچھلی شہری کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ ادارہ ہماری زبان مرحوم کے لیے دعائے مغفرت اور سلام صاحب کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

انجمن پٹیالہ کی سرگرمیاں

پٹیالہ میں گزشتہ روز پنجاب کے اردو دوستوں کی ایک خاص میٹنگ منعقد ہوئی جس میں مقامی شعراء ادباء اور معززین شہر کے علاوہ چنڈی گڑھ، برنالہ، نابھہ، مالیرکوٹلہ، فرید کوٹ اور دیگر شہروں کے نمائندے بھی شامل ہوئے۔ وہ حضرات خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جو انجمن ترقی اردو کی جے پور کانفرنس میں شرکت کے لیے پنجاب صوبائی برانچ سے بطور ڈیلیگیٹ گئے تھے۔

میٹنگ کی صدارت اردو کے مشہور شاعر پروفیسر کرپال سنگھ صاحب بیدار نے فرمائی، اور میٹنگ میں پنجاب کے اندر اردو زبان کی تعمیر کے احیا اور اس زبان کی ترویج و ترقی کے لیے تجاویز پر غور و خوض کیا گیا۔

سب سے پہلے شری سورج تنویر نے جو چنڈی گڑھ سے میٹنگ میں شمولیت کے لیے آئے تھے۔ اس اجلاس کی غرض و غایت بتانے کے علاوہ کل ہند اردو کانفرنس جے پور کی کارروائی اور اس کے فیصلوں پر مفصل روشنی ڈالی۔ اس کے بعد پروفیسر راجندر سوز، پروفیسر نرتیش، جناب شباب، جناب ساغر شغائی، جناب طالب، جناب سوز، شرمن، حکیم زار اور دیگر اصحاب نے بحث میں حصہ لیا۔ گہرے غور و فکر کے بعد اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب کے مختلف شہروں میں اس قسم کی میٹنگیں کرنے کے بعد بہت جلد پنجاب بھر کے اردو دوستوں کی ایک عظیم کنونشن بلانے کا انتظام کیا جائے جس میں مرکزی انجمن ترقی اردو کے نمائندوں سے بھی شرکت کی استدعا کی جائے۔

پنجاب کے مختلف شہروں میں میٹنگیں کرانے کے لیے مفصل پروگرام طے کیا گیا۔ فوری طور پر مندرجہ ذیل اصحاب کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ مقامی محبان اردو کی وساطت سے ماہ نومبر کے دوران میٹنگیں کرانے کا کام مکمل کریں ان حضرات کے نام یہ ہیں۔ جناب کرپال سنگھ بیدار، جناب نوبہار صابر، جناب ساغر شغائی، جناب اودے سنگھ شائق، حکیم ادم پرکاش زار، جناب کوثر علی شاہد، جناب اختر رضوانی، جناب کرشن کمار طور، جناب مہر چند کوثر، جناب عبدالرحیم چوہان، جناب نرتیش، جناب ماسٹر لطافت التمدو اور جناب سورج تنویر ــــ فی الحال اور فوری طور پر مندرجہ ذیل شہروں میں وہاں کے مقامی اردو دوستوں سے مل کر میٹنگیں کرنے کا پروگرام مکمل ہوا ہے: نابھہ، سامانہ، راجپورہ، برنالہ، سنگرور، رامپورہ پھول، بھٹنڈہ، مالیرکوٹلہ، لدھیانہ، جالندھر، چنڈی گڑھ، انبالہ، امرتسر۔ باقی شہروں میں میٹنگیں کرنے کا پروگرام بھی جلد از جلد طے کیا جائے گا۔

(سورج تنویر)

برہان پور انجمن کا جلسۂ اردو

انجمن ترقی اردو شاخ برہان پور کا جلسۂ اردو یکم نومبر سنہ ۱۹۷۲ء شب میں ۹ بجے گاندھی بھون میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت صدر انجمن محترم حاجی ظہور حسین صاحب رشتی جعفری نے فرمائی۔ انجمن کے جوائنٹ سکریٹری اقبال نصیب نے ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی کی یاد میں نظم سنا کر جلسہ کا افتتاح کیا۔ نظم کے بعد اقبال نصیب نے کل ہند اردو کانفرنس جے پور کی مختصر رپورٹ سنائی۔ محترم حنفا الرحمٰن صاحب انصاری نے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کے خطبۂ صدارت کی روشنی میں فرمایا کہ اردو کے مسئلہ کو فرقہ پرستی کا مسئلہ سمجھ لیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا اس وقت اردو والوں کو بڑے جوش سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ برہان پور کی حالیہ مردم شماری کی رپورٹ میں اردو کو اکثریت کا درجہ حاصل ہے لہٰذا نگر پالیکا کی دفتری زبان اردو ہونا چاہیے۔ نائب صدر نگر پالیکا نیز حاجی صلاح الدین صاحب نے فرمایا کہ انجمن کا یہ جلسہ اردو کانفرنس کی بازگشت ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ہمیں عملی جد و جہد سے اردو کو اس کا جائز مقام دلانا ہے۔ نیز حاجی صاحب نے ان دو تجویزوں کو دہرایا جو کانفرنس میں برہان پور انجمن نے پیش کی ہیں۔ نمبر ۱ گورنمنٹ بیسک ٹیچرس ٹریننگ کالج برہان پور کی اپنی ذاتی عمارت اور ہوسٹل ہونا چاہیے۔ نمبر ۲ گورنمنٹ اردو گرلز مڈل اسکول کو ہائی اسکول میں تبدیل کیا جائے۔ شہر کے بزرگ استاد شاعر حضرت ریاضی صاحب نے فرمایا کہ اردو کے لیے اتنی اچھی باتیں ہوئیں کہ اب میرے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ صدر انجمن محترم رشتی صاحب نے فرمایا کہ انجمن کے کاموں میں خود ممبران دلچسپی نہیں لیتے آج کے جلسہ میں ہی دیکھیے کون کون ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ چار پانچ ہزار انجمن کے ممبر بنائے جائیں اور نئے انتخابات کرائے جائیں یہ کام برہان پور جیسے شہر کی اردو آبادی کے لیے کوئی دشوار نہیں۔ صدر انجمن نے اپنی تقریر کے بعد جلسہ کے اختتام کا اعلان فرمایا۔

(اقبال نصیب۔ جوائنٹ سکریٹری انجمن ترقی اردو شاخ برہانپور)

بھوپال میں تحقیقی مقالے

اردو کے علمی و ادبی حلقوں کے لیے یہ خبر انتہائی مسرت کا موجب ہوئی کہ امسال بھوپال میں چند عمدہ اور مفید تحقیقی مقالے یونیورسٹیز کے لیے لکھے گئے۔ جناب ابو محمد سحر نے "ناسخ کی اردو ادب کو دین" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر آگرہ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جناب عبدالودود کے مقالے کا موضوع تھا "اردو نثر میں ادب لطیف" آپ نے یہ مقالہ وکرم یونیورسٹی کے لیے لکھا تھا۔ آپ اردو کے پہلے ریسرچ اسکالر ہیں جنھیں وکرم یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کا اعزاز ملا ہے۔

ایم۔ اے کے امتحان کے لیے ذیل کے مقالے لکھے گئے

اردو شاعری اور تحریکِ آزادی (مختصر جائزہ)	رشید قریشی
خاکہ نگاری کے مجموعوں پر ایک نظر	نزہت سلطانہ

جناب ابو محمد سحر کا مقالہ زیر طبع ہے۔

عبدالحی

تبصرہ

شعلۂ حیات (مدھیہ پردیش، اردو نمبر)

اڈیٹر: ایم عرفان

ملنے کا پتہ: شعلۂ حیات، جہانگیر آباد، بھوپال

قیمت: ۵۰ پیسے

اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں جے پور میں ہونے والی کل ہند اردو کانفرنس کی تقریب میں پندرہ روزہ شعلۂ حیات کا مدھیہ پردیش، اردو نمبر شایع ہوا تھا۔ اس نمبر میں مدھیہ پردیش میں اردو کی عہد بہ عہد تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اڈیٹر شعلۂ حیات بھوپال کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس پرچے کے زیادہ تر مضامین میں جو انھیں کے لکھے ہوتے ہیں، حالات کا جائزہ اسی وقتِ نظر سے لیا گیا ہے۔

انجمن ترقی اردو کی ریاستی اور مقامی شاخوں کی کارگزاری کی تفصیلی رپورٹ شعلۂ حیات کے ان صفحات میں شامل ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ہر قدم پر مشکلات اور رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے بھی انجمن کے کارکنوں نے ایک مضبوط عزم اور بے مثال قوتِ عمل سے ساری ریاست میں انجمن کی شاخوں کا جال بچھا دیا ہے اور کس طرح مختلف مقامات پر اردو مدرسے اور کتب خانے قائم کیے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر نوٹ کیے جانے کے لائق ہے کہ بعض ان مقامات پر جہاں اردو دوستوں کی آبادی بہت کم ہے انجمن کی کوششوں سے لوگوں کی خاصی تعداد نے اردو سیکھ لی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور اردو کے متعلق اکثریت کے رویہ کی طرف سے بدظن ہیں یہ ایک اچھی مثال ہوگی، اگر ہم اردو کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت مناسب انداز میں اور پیہم کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اکثریت کی حمایت اور اعتماد نہ حاصل کر سکیں۔

جن لوگوں کو انجمن کی بے عملی کی شکایت ہے ان کے لیے اس پرچہ کا مطالعہ کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس پرچے میں اور بھی بہت سی مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں، مثال کے طور پر بھوپال کے ادبا و شعرا کی تصانیف کی فہرست۔ بھوپال سے نکلنے والے اخبارات و رسائل کی تفصیلات بھی اس پرچے میں موجود ہیں۔

بھوپال کے قدیم و جدید شاعروں کے کلام کا انتخاب دیکر اس پرچے کو خشک دستاویز ہونے سے بچا لیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ایک قابل قدر پیش کش ہے بالخصوص بھوپال کی ادبی اور صحافتی تاریخ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس پرچے میں خاصا کار آمد مواد موجود ہے۔

اُردو اسی ملک کی زبان ہے

لکھنؤ۔ ۱۰ر نومبر۔ اچھی شاعری سے اچھی تہذیب پیدا ہوتی ہے اردو ہمارے دیش کی ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کے وکاس سے ہندی کو ترقی ملتی ہے۔

یہ خیالات لکھنؤ کارپوریشن کے ڈپٹی میئر شری رام پرکاش ایم۔ ایل۔ سی (جن سنگھ) نے میر اکاڈمی کے ایک جلسہ میں کل شام یہاں اکاڈمی کے دفتر لاری ہاؤس میں ظاہر کیے۔

انھوں نے کہا "ہندی کے راشٹر بھاشا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ دوسری زبانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالے"۔ ڈپٹی میئر نے مزید کہا کہ "اردو کو غیر ملکی زبان سمجھنا اور اس کو ترقی کے مواقع نہ دینا اچھی بات نہیں ہے"۔

جن سنگھی رہنما نے میر تقی میر کی ادبی خدمات کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا "میر تقی میر جیسے بڑے شاعر کے نام سے جو سنستھا بنائی جائے گی میں اس کی سیوا کو اپنے لیے باعث فخر سمجھوں گا۔ میں میر اکاڈمی کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ اس کا میں یقین دلاتا ہوں"۔

میر اکاڈمی کا یہ جلسہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (صدر شعبۂ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا۔

صدر جلسہ نے میر کے ایسے عظیم شاعر کی یاد کو جو اتر پردیش کی راج دھانی لکھنؤ میں مدفون ہیں زندہ رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا "باہر کے لوگ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں یہ جان کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ لکھنؤ نے اپنے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مسلسل بے اعتنائی برتی ہے۔ آج ان کی قبروں کے نشان تک نہیں"۔

ڈاکٹر ہاشمی نے کہا "اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مشاہیر شعرا و ادبا جو یہاں مدفون ہیں ان کی یادگاریں قائم کی جائیں"۔

مولانا خیر بہوروی نے میر اکاڈمی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے "میر روڈ" اور "میر پارک" کی تجویزوں کا حوالہ دیا جسے میر اکاڈمی نے منظور کیا تھا اور جس کی تائید شہر کی تقریباً سبھی انجمنوں اور شخصیتوں نے کی ہے۔

انھوں نے ڈپٹی میئر شری رام پرکاش کو توجہ دلائی کہ ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لکھنؤ کارپوریشن کو اقدام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ اہل شہر کی یہ بہت بڑی خواہش ہے۔

ڈاکٹر محفوظ احمد لاری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور شری شکور احمد لاری نے شکریہ ادا کیا۔ (قومی آواز۔ لکھنؤ)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضیاء الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا